حیات شبلی از سید سلیمان ندوی

(محاسن و معائب کا جائزہ)

Life of Shibli as Narrated by Syed Sulaiman Nadvi

ڈاکٹر خالد محمود*

زبیر صدیقی**

Abstract

Various aspects of life of Shibli have been discussed herein this research. Shibli was a great personality and many famous people of that time were connected with him including Sir Sayed Ahmed Khan. However, one of his luminaries Syed Suleman Nadwi observed and illuminated his personality through a unique angle; no one could do it. Sayed Suleman Nadwi wrote the biography of his teacher and illustrated the aspects of his life. "Hayat-i-Shibli" was published by Darul Musanifin, Aligarh in 1979. It is the detailed biography having almost 850 pages. Sayed Suleman Nadwi belonged to the province of Bihar in India. He was born on 22 November 1884 at "Waseena", a town near Pattna district and achieved his early education at home. He joined Darul Uloom Nadwa in 1901 and found Shibli as his teacher. After the death of Shibli, Syed Suleman Nadwi completed his book "Seerat un Nabi' and also wrote his biography to fulfill the duty as a good student of Shibli.

* لیکچرار شعبہ مطالعہ پاکستان، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، اسلام آباد

** لیکچرر اُردو، ایف جی لیاقت علی ڈگری کالج فار بوائز، پشاور روڈ، راولپنڈی۔

تلخیص

زیر نظرمقالہ میں 'حیاتِ شبلی' کے مختلف موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یوں تو شبلی ایک نمایاں ہستی تھے اور سرسید سمیت متعدد لوگ ان سے منسلک تھے لیکن ان کی ذات کو جس رخ سے ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے دیکھا اور بیان کیا، شائد کوئی اور ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ سید سلیمان ندوی صاحب نے 'حیات شبلی' لکھتے ہوئے اپنے استاد کی زندگی کے ان گوشوں سے بھی آشنا کیا جن سے ان کے علاوہ شاید ہی کوئی واقف ہو۔ سید صاحب کی تصنیف 'حیاتِ شبلی' مطبع معارف دارالمصنفین، اعظم گڑھ سے شائع ہوئی اور اس کا سن اشاعت ۱۹۷۹ء ہے۔ یہ ایک ضخیم سوانح ہے جو تقر یباً ۸۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ سید سلیمان ندوی کا تعلق بھارت کے صوبہ بہار سے تھا۔ سید صاحب ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو ضلع پٹنہ کے ایک قصبہ دسینہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر حاصل کی۔ ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوئے تو انہیں شبلی نعمانی جیسے استاد کی صحبت نصیب ہوئی۔ سید صاحب نے اپنے استاد کی محبت کا حق ادا کرنے کے لیے ان کی کتاب سیر ت النبیؐ کو مکمل کیا اور ساتھ ہی ان کی سوانح حیات مرتب کر کے حق شاگردی ادا کرنے کی سعی کی۔

ہم مشرقیوں کی عادت ہے کہ ہر چیز پر ایک پردہ ڈال کر دیکھتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ اس طرح ہماری چشم تصور کو ایک خیالی منظر پیدا کرنے میں زیادہ دلکشی نظر آتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو ہوتا ہے کہ اصل چیز کے خدو خال ہماری نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی بڑی ادبی شخصیت مثلاًحافظؔ، رومیؔ، غالبؔ، اقبالؔ کا تعلق ہو تو یہ پردے کچھ اور بھی دبیز ہو جاتے ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نظروں تک ان تابناک ہستیوں کی ایک خاص وضع ہی کی جھلکیاں چھن چھن کر آئیں اور ایسے عکس جو ہم ان سے وابستہ کرنا پسند نہیں کرتے، نظروں سے پوشیدہ رہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو کشش کسی شخصیت کی اصلی وضع میں ہوتی ہے، اس کے خیالی یا فرضی تصور میں نہیں ہوسکتی۔ اس طرح ہم اس کو ایک گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان کی حیثیت سے اس کی خوبیوں اور برائیوں کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو ایک حقیقت پرست کے لیے ایک خاص کیفیت رکھتا ہے۔سوانح

نگاری میں یہی مسلک سب سے زیادہ صحیح اور مناسب ہوتا ہے۔ آخر ہمیں کیا اختیار ہے کہ جس طرح قدرت نے کسی فرد کو پیدا کیا اس میں تغیر اور تبدل کرکے ایسا پیکر تراشیں جو ہماری جمالیاتی احساس کی تشفی کرے۔چنانچہ مغرب میں یہ روش بہت عام ہے کہ سوانح نگار جس شخصیت پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تفصیل پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے، خواہ کیسی ہی بری یا گھناؤنی کیوں نہ ہو۔ خود ہمارے سوانح نگاروں میں مولانا حالؔی ہی کو لے لیجئے، جنہوں نے سر سید کے متعلق ان کے عنفوان شباب کو لاابالیانہ مشاغل سے آخری عمر کی سنجیدہ سیاسی سرگرمیوں تک ہر چیز کو حتی الامکان قلم بند کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے سر سید کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا اور نہ ان کے نام کی درخشندگی ماند پڑجاتی ہے بلکہ اس سے تو ان کی طبیعت کی قدرتی نشونما پر روشنی پڑتی ہے۔

ہمارے مصنفین میں مولانا شبلؔی نعمانی ایک خاص طبیعت کے مالک تھے۔ قدرت نے انہیں صحیح معنوں میں ایک شاعر، ایک رند پارسا پیدا کیا تھا۔ ان کے ہر لفظ سے ان کا غیر معمولی جمالیاتی ذوق جھلکتا ہے۔ اب ہم اگر مولانہ شبلی کی فطرت کے صرف اس پہلو ہی پر نقاب ڈال دیں تو ظاہر ہے حقیقی شبلؔی ہماری نظروں کے سامنے نہیں آسکتا۔ مصنف "حیاتِ شبلؔی" نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ ایک عظیم انسان تمام تر فیض کا پیکر ہوتا ہے، شبلؔی کو اس رنگ میں پیش کیا کہ وہ محض ایک دیوتا معلوم ہوتا ہے جس سے ہم مرعوب تو ہو سکتے ہیں لیکن اسے دیکھ کر کوئی کشش محسوس نہیں کرتے۔اس مختصر مقالے میں مولانہ شبلؔی کی زندگی کے ان محاسن و معائب پر بحث کی گئی ہے، جسے مصنف 'حیاتِ شبلؔی' نے احتراماًعام نظروں سے چھپانے کی کوشش کی ہے۔مولانہ شبلی کی ذات سے بہت سے لوگ اس طرح وابستہ ہوتے چلے گئے جس طرح سورج کے گرد سیارے ان میں کچھ ان کے شاگرد تھے، کچھ ہم عصراور کچھ ایسے جنھوں نے دور دور سے فائدہ اٹھایا، ان کے کچھ شاگردوں میں سب سے پہلے مولانا سید سلیمانؔ ندوی کا نام آتا ہے۔

سید صاحب سوانح نگار ،ناقد اور مورخ تھے ۔مگر وہ معلم،متکلم،اور ادب وفلسفہ کے

اتنے بڑے نباض نہ تھے جتنے مولانا شبلی۔ انہوں نے مولانا کی ''سیرت النبیؐ'' کو بڑی خوش اسلوبی سے اختتام تک پہنچایا مولانا اس کوشش میں ان کے دوسرے رفقاء بھی شریک تھے۔ انھوں نے شبلی کی بڑی مبسوط سوانح عمری لکھی۔ان کے اکثر مضامین تنقید کے علاوہ تبصروں پر بھی مشتمل ہیں۔ سید صاحب کا رجحان عام طور پر سادگی،دل دوزی اور تصوف کی طرف ہے۔یہاں وہ شبلی سے بہت مختلف ہیں اور اس کی وجہ بہت سے کلامی مسائل ہیں۔ وہ نہ شبلی سے اتفاق کرتے ہیں نہ سر سید سے۔ اس نقطہ نظر کے باعث وہ علی گڑھ کے حامی بھی معلوم نہیں ہوتے۔

حیاتِ شبلی کو بنیادی طور پر'' تین'' حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(ا) پورب کے علماء یعنی اعظم گڑھ کا عہد اور ان کی تصانیف کے بارے میں

(ب) مولانا شبلی کی سوانح حیات کے حوالے سے

(ج) مولانا شبلی کی قومی اور علمی زندگی و خدمات کے بارے میں مفصل بیان

تیسرا حصہ بھی دو مزید حصوں میں تقسیم ہے۔

(ا) ایک حصہ کتابوں کے تعارف پر ہے۔

(ب) دوسرا حصہ قومی ،مذہبی ،تعلیمی خدمات کے حوالے سے ہے۔

فہرستِ مضامین وحواشی کے بعد تعارف میں سید سلیمان ندوی سوانح کے ذرائع علم میں لکھتے ہیں:

> خاکسار نے استاد مرحوم کی صحبت و تربیت میں مسلسل آٹھ برس (۱۹۰۵ء، ۱۹۱۲ء) تک مسلسل گزارے اور دو برس اس طرح کہ جسم کہیں رہا مگر روح ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔ یہ دس برس درحقیقت ان کی بتیس برس کی علمی، قومی زندگی کے سب سے مصروف ایام تھے، بلکہ انہی کو ان کے ستاون برس کے حاصل کا حاصل کہا جاسکتا ہے۔''(۴)

یہاں سید سلیمان ندوی نے ابتداء حیات میں ہی علی گڑھ سے بے رغبتی ظاہر کی اور ان کی زندگی کا حاصل انہی دس برس کو قرار دیا مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے وہ ایام جو علی گڑھ اور سر سید کے ساتھ بسر ہوئے وہ ان کی علمی، قومی زندگی میں شامل نہیں۔شبلی کو شبلی بنانے والے ایام اور ان افراد کا تذکرہ تک نہیں کیا؟

نواب صدریارجنگ، مولانا حبیب الرحمان شیروانی اور مولانا کے علی گڑھ کے پرانے دوست میر ولایت حسین صاحب سے قیام علی گڑھ اور تعلقات سر سید کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ مولانا شبلی کی سوانح کے حوالے سے پہلا مضمون اگست۱۹۱۲ء میں رسالہ "ریولو آلہ آباد" میں چھپا۔ جس کے مصنف ''فرد شاہ منیر عالم''صاحب تھے۔

سید صاحب مولانا کی سوانح حیات کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''فخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے۔ کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا۔''(۵)

سید صاحب کی سوانح لکھنے سے پہلے مختلف مضامین، آرٹیکل وغیرہ مولانا شبلی کی زندگی کے حوالے سے مختلف رسائل میں شامل ہوتے رہے۔

'حیاتِ شبلی' میں مولانا شبلی کے خاندانی حالات کا پہلے کام عبدالسلام ندوی کے سپرد کیا گیا،پھر اس کے بعد یہ کام مولانا کے شاگرد اقبال احمد صاحب سہل ۔ایم۔اے، ایل ۔ایل۔ بی وکیل اعظم گڑھ کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے عبدالسلام ندوی کے کام کو آگے بڑھایا۔ان کے بعد سوانح کا کام خود مولانا نے سنبھالا اور 'حیات' کا آغاز۱۹۴۰ء میں کیا اور ۱۹۴۲ء میں انجام کو پہنچا۔ مولانا حبیب الرحمان شیروانی نے 'حیاتِ شبلی' پرنظرِ ثانی کی۔

'حیات' کی ابتداء میں سید صاحب خود اعتراف بیان تحریر کرتے ہیں:

''خاکسار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانح عمریوں کے صحیح اصولوں پر پوری منطبق ہے۔ تاہم یہ کوشش کی گئی ہے جو کچھ معلوم ہوا، اس کو بے کم و کاست سپردِ قلم کر دیا جائے۔''(۶)

'حیاتِ شبلی' صرف ایک شخص کی سوانح عمری نہیں بلکہ یہ حیات اس عہد کے مسلمانان ہند کے پچاس برس کے عملی، ادبی، سیاسی، تعلیمی و مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات بھی درج ہوئے ہیں جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لیے جاننا ضروری تھا۔

'حیاتِ شبلی' کا نام مولانا شبلی کا خود تجویز کردہ تھا۔ سید صاحب نے سوانح کے دیباچہ

میں پچھلی صدی کے اہم اور چیدہ چیدہ حالات و واقعات بیان کیے ہیں۔ اس میں ان علماء کرام کا تذکرہ بھی تھا جنہوں نے دین و ملت کے لیے نمایاں کارنامے انجام دیئے مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ دیباچہ میں مولانا کی اہم تصانیف اور حالات زندگی کے بارے میں معلومات تحریر ہیں اور ان کی علمی ادبی اور مذہبی خدمات کا تذکرہ ہے۔ خیالات، رجحانات اور جدید علوم کے حوالے سے ان کی ذہنی کشمکش کا بھی بیان ہے۔ حیات کا دیباچہ مولانا کے افکار و خیالات، مذہبی رجحانات اور تصانیف کے حوالے سے ایک اہم تذکرہ ہے۔دیباچہ میں ہمیں مولانا کے مذہبی رجحانات اور ان کے عہد کے اہم واقعات و حالات سے واقفیت ملتی ہے اور مولانا کی طرز حیات کی ایک مختصر روداد نظر آتی ہے۔

سوانح نگار سے یہ توقع نہیں کی جاتی ہے کہ وہ صاحب سیرت کی زندگی کی بعض بنیادی باتیں نظر انداز کردے بلکہ یہ کوشش کرے کہ شخصیت کی صحیح اور جامع تصویر پیش کی جائے ایسا کرنا مناسب نہیں کہ صا حب شخصیت کی زندگی کے متعلق وہ مواد ہی نکال دیا جائے جو عقیدت مندوں کو پسند نہیں۔

''سوانح نگار کو شخصیت سے نسبت کے ہر پہلو کو دکھانا چاہئے۔ سیاہ بھی اور سفید بھی، روشن بھی اور تاریک بھی۔'' (۷)

کسی کے معائب کو دکھانا تنگ نظری نہیں ہے بلکہ اس کے دکھانے سے شخصیت کے ان پہلوؤں سے بھی آشنائی ہوتی ہے جن کی وجہ سے ممدوح کی شخصیت مجروح نظر آتی ہے۔خود شبلی کا سوانح کے متعلق خیال تھا کہ سوانح اور سیرت میں زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر کیا جائے۔ اسی سلسلے میں ایک خط نواب حبیب الرحمان شیروانی جو کہ صحا بہؓ کے حالات پر کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''صحابہؓ کے حالات سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے لیے نمونہ نہیں بن سکتی لیکن ہر پہلو کو لیجئے اور ہر پہلو کو صاف دکھلایئے جن سے آج کل کے مولوی قصداً چشم پوشی کرتے ہیں۔''(۸)

شبلی ان لوگوں سے نالاں تھے جو کسی کے معائب دکھانے کو تنگ خیالی اور بد نیتی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:''اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہوجائیں''۔

حالی کی سوانح 'حیات جاوید' پر اظہار خیال کرتے ہوئے شبلی کہتے ہیں:

> حیات جاوید میں حالی نے سر سید کی یک رخی تصویر دکھائی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب کو دکھانا تنگ خیالی اور بدطینتی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں۔ پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے سوائے اس کے کہ وہ محض دعویٰ کرتے تھے واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے۔ بہرحال 'حیات جاوید' کو مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔ (۹)

ہم اب شبلی کی زندگی کے ان محاسن و معائب کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں، جن سے سید صاحب نے سوانح میں پردہ پوشی کی ہے اور حالات اور واقعات کا ایک رخ پیش کرنے سے مولانا شبلی کی شخصیت مجروح و مشکوک نظر آتی ہے۔

سرسید اور شبلی کے درمیان حسد یا رشک کا جذبہ نہیں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے دل سے قدر دان تھے۔ چھوٹے موٹے اختلافات کہاں سے ہوتے۔

''شبلی کا اختلاف ذاتی نہیں بلکہ عقائد اور کچھ حد تک سیاسی زاویہ نگاہ سے تھا''۔(۱۰)

''سرسید دعا کے قائل نہ تھے' '۔(۱۱)

''سرسید کے خیال میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا علاج صرف یہ تھا کہ وہ مذہب کے سوائے ہر چیز میں انگریز ہوجائیں''۔(۱۲)

سر سید ایک عملی آدمی تھے اور اپنے وضع کردہ اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور جن اساسی بنیادوں پر انہوں نے کالج کی بنیاد رکھی، ان اصولوں کے خلاف اگر کوئی کام ہوتا تو اس کی مخالفت شدومد سے کرتے تھے۔ لیکن باقی معاملات میں وہ اختلاف سے گریز کرتے تھے۔ شبلی کا سر سید سے سیاسی معاملات پر اختلاف تھا اور بارہا ان معاملات میں شبلی اور سرسید میں مباحث ہوا کرتے تھے۔کیا یہ اختلافات اس قابل تھے کہ ان کی بنا پر

سر سید مولانا شبلی کو کالج سے نکال دیتے اور اگر معاملات میں اتنا ہی تضاد تھاتو سید صاحب نے شبلی کی جن عادات واطوار کا تذکرہ کیا ہے توان میں خود دار آدمی بھلا غلط کام کیسے کر سکتا ہے یا وہ کوئی غلط بیانی کیسے برداشت کر سکتا ہے۔

سر سید سے شبلی کے ذاتی اختلافات نہیں تھے۔ کالج کے معاملات ،نصابی سرگرمیاں اور دیگر سیاسی امور پر اختلافات سے ذاتیات پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

اگر سر سید اپنی ہر بات پر آمنا و صدقنا کے قائل بھی تھے تو کیا سر سید نے اپنی اس عادت کی بنا پر شبلی کو کالج سے نکال دیایا ان کی کالج میں زندگی دوبھر کردی؟ حقیقت یہ ہے کہ سر سید کا جنازہ کالج سے پہلے نکلا اور شبلی کالج سے علیٰحدہ بعد میں ہوئے۔

دونوں کا ایک اختلاف یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ سید صاحب ظاہر کرتے ہیں کہ شبلی نے سر سید کی سوانح لکھنے سے انکار کر دیا تھامگر اس روایت کے حوالے سے کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا کہ سوانح کے معاملے میں سر سید کے شبلی سے کیا اختلافات تھے۔ 'الفاروق' کے معاملے میں اختلاف تھا۔

''سر سید کی اپنی سوانح کے حوالے سے اختلاف تھا۔(۱۳)

اگر مولانا کے سرسید سے اختلافات تھے تو ان کے گھر میں رہنے، ان کے کتب خانے سے استفادہ کرنے کالج کی تمام سرگرمیوں میں یونین کے جلسوں میں انجمن لنبتہ الادب کے بانی، علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر کی حیثیت سے، ایجوکیشن کانفرنس کے جلسوں میں، ڈنر میں، نمائش میں شبلی نہ صرف شریک بلکہ پیش پیش ہیں۔ سر سید کے ساتھ حیدرآباد جاتے ہیں۔ نئی تال جاتے ہیں، کتابیں کالج کی نذر کرتے ہیں۔ غرض ہر طرح سے معاون اور مددگار ہیں تو وہ سر سید کے مخالف کیسے ہوسکتے ہیں۔(۱۴)

''مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ہیں چار ہفتے سے بلدہ میں مقیم ہیں۔مولوی صاحب ایک قابل اور لائق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں۔ ان کی تمنا یہ ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کر لیں اور مولوی درس و تدریس کو ترک کردیں''۔(۱۵)

کالج سے علیٰحدگی کا سبب سر سید سے اختلافات نہیں تھا بلکہ کالج کی معمولی درس وتدریس سے ان کے تصنیفی کاموں میں حرج ہوتا تھااور وہ چاہتے تھے کہ اپنے اصل کام

یعنی تصنیف و تالیف میں زیادہ سے زیادہ وقت نکالیں۔

سید صاحب نے شبلی کی سوانح میں اکثرو بیشتر زبانی روایتوں سے بھی کام لیا، اور اس کی سند کو جانچنے کے لیے کسی تحقیق کی زحمت نہ کی بلکہ انہیں مِن و عَن شائع کر دیا۔ سوانح نگاری کے اصولوں کے نقطہ نگاہ سے شہادتوں یا زبانی روایات کو تصدیق کے بعد مستند قرار دے کر شائع کرنا چاہئے۔ اس میں مبالغے سے کام لینا جائز نہیں ہے۔ انسانی ذہن بعض اوقات ماضی کے معاملات، حالات و واقعات کافی حد تک بھول جاتا ہے۔ یہ ایک بشری کمزوری ہے۔ سید صاحب نے اکثر جگہ روایات کی بنیادپر نظریہ طے کرکے تحریر کر دیا ہے۔اس لیے ان روایات کو ہم مستند قرار نہیں دے سکتے جب تک ان کی شہادتیں کسی دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہو جائیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کی سنت سے کئی روایات منسوب ہوتی ہیں اور ہر ایک کا بیان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ محض کسی روایت پر نظریہ تشکیل دینا واقعہ کی صحت کو نقصان پہنچاتا ہے۔کالج چھوڑنے کی اصل وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کی تصنیفی صلاحیتوں کو زنگ لگتا ہو اور یہ درس و تدریس کے کام کی وجہ سے تصنیفات کو وقت نہ دے پارہے ہوں۔ اس ضمن میں سر سید کی ان کے تصنیفی کاموں میں حرج کی وجہ سے نظام کے نام خط میں شبلی کے تصنیفی وظیفے کے اعلان کے حوالے سے تحریر موجود ہے۔ اس کے بعد شبلی نے کالج میں مستقل قیام ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔

ندوہ کے اختلافات کے حوالے سے بھی سید صاحب نے اپنے اِستاد سے عقیدت کا دامن نہ چھوڑا اور ان معاملات کی صحیح نشاندہی نہیں کی جن سے مولانا شبلی کے ندوہ سے اختلافات کی اصل صورتحال واضح ہوتی ہو ۔شبلی کے ندوہ سے اختلاف کے بارے میں شیخ اکرام رقم طراز ہیں:

''شبلی کے ندوہ سے اختلافات جو تھے،ان میں ایک اختلاف تو ذاتیات پر تھا''۔(۱۶)

کیا مولانا شبلی کی نگاہ اس نکتے تک نہیں پہنچتی تھی باوجود یہ کہ وہ نیشنل کانگریس کو پسند کرتے تھے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کی وجہ سے نیشنل کانگریس کی تحریک دبی

نہیں بلکہ اور ابھرتی تھی۔ مذہبی علماء میں جتنے نیشنلسٹ پیدا ہوئے، اِتنے انگریزی دان طبقے میں بھی شاید نہیں ہوئے۔ پھر انگریزی حکومت نے ہمارے مذہب اور کلچر میں کوئی مداخلت نہ کی بلکہ انہیں خود ہی پروان چڑھنے دیا۔ لارڈ میکالے کے سوا تمام انگریز افسروں اور دانشوروں نے اسکولوں میں دیسی زبانوں میں ایسی تعلیم پر زور دیا جو روایتی بھی ہواور مغربی بھی۔ یہ ایک ایسی پالیسی تھی جو انگریز نے پہلے ہی دن سے قائم کی۔ کانگریس سے اس کا تعلق نہیں تھا۔ بہرحال اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ کانگریس کے غلغلے کی وجہ سے حکومت کو مذہبی تعلیم کی ضرورت کا احساس ہو گیا تھا۔ جبکہ حالؔی لکھتے ہیں کہ: ''مذہبی تعلیم اگر کچھ کر سکتی تھی تو یہ کہ مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے متنفر کرے، اپنی قدیم تہذیب کی طرف دیکھے، اپنے خلفاء ائمہ اور سلاطین کی یاد میں آنسو بہائے''۔ انگریز حکومت کے نقطہ نظر سے وفاداروں کا طبقہ انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں تھا نہ کہ مدرسوں اور خانقاہوں میں۔ ورنہ اکبر الہ آبادؔی جیسے لکھنے والوں کو کالج اور سر سید پر طنز کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور شبلؔی جیسے مذہبی لوگ کالج اور لیگ سے برگشتہ نہ ہوتے۔ انگریزوں کے نزدیک تو مسلمان مذہبی علماء کی وفاداری مشکوک ہی رہی اور جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے۔ مولانا شبلؔی بھی انگریز حکام کے شک وشبہ سے نہیں بچ سکے تھے۔اگرچہ ندوہ کے متعلق یہ بات اتنی درست نہیں ہے جتنی دیوبند کے متعلق درست ہے۔اس لیے کہ مولانا شبلؔی کا مقصد بہرحال یہ تھا کہ نئی اور پرانی تعلیم کے ڈانڈے ملائے جائیں۔ ندوہ میں ان کی شکست اور ناکامی کاایک سبب یہ دورنگی بھی ہے، جس کے وہ شکار تھے۔ ندوہ میں کام کرنے کے باوجود علماء کا ایک طبقہ شبلؔی کو پھر بھی علی گڑھ کالج کا ایک سفیر سمجھتاتھا اور انہیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ اس بارے میں حبیب الرحمان خان شیروانی لکھتے ہیں:

> علامہ شبلؔی چونکہ سالہا سال تک کالج میں رہے تھے، ایک حدتک ان کے خیالات آزاد تھے۔ علماء کے مروجہ رسمی طریقوں کو وہ لوازم دین خیال نہیں کرتے تھے۔ اعتراض کرنے میں بے باک تھے۔ ان کی وسیع نظر کے سامنے متقدمین کا دور اور اس کے آثار تھے۔ لہٰذا متاثرین کے انداز کے زخم خوردہ نہ تھے۔ یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قدیم علماء کو ان کی جانب سے نئے شبہات تھے۔بعض علماء کا عرصہ تک یہ خیال رہا کہ مولانا شبلؔی کالج

کے سفیر بن کر ندوہ میں آئے تھے تاکہ یہاں بھی الحاد کا رنگ جمائیں۔(۱۷)

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شبلی کا اراکین ندوۃ سے اختلاف نصاب اور انگریزی کے مسئلے پر تھا۔ چنانچہ ''سیرت محمد علی مونگیری'' سے شیخ محمد اکرام نے '' یاد گار شبلی'' میں یہ اقتباس نقل کیا ہے۔

> مولانا شبلی چاہتے تھے کہ قدیم نصاب جن میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے وہ سب کی سب قبول کر لی جائیں۔ قدیم تعلیمی ڈھانچہ یک قلم منسوخ کردیاجائے اور انگریزی کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے لیکن مولانا محمد علی نہ اس عجلت کو مفید سمجھتے تھے نہ ممکن۔(۱۸)

مولانا شبلی نے الندوہ مارچ ۱۹۰۹ مشرقی یونیورسٹی میں اپنے خطاب میں کہا کہ:

> ''یہ ہم نے بارہا کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے نہ قدیم مدرسوں کی۔ ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے کس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے''(۱۹)

آخر انہی کے اصرار سے ۱۹۰۳ء میں انگریزی ایک ضروری مضمون کی حیثیت سے ندوہ کے نصاب میں شامل کی گئی۔

'حیاتِ شبلی' کے مطالعے سے شبلی کے نظریات، افکار و خیالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شبلی پان اسلام اِزم کے بہت بڑے داعی تھے۔ ان کی تحقیقات اس ملی جذبے کو پانے اور اسے جدید زندگی سے ہم کنار کرنے کے لیے صرف ہوئی ہے۔دوسرا اظہار عمرانی تغیر کا نظر آتا ہے جو شبلی کے علاوہ سر سید کے تمام رفقاء میں موجود ہے۔ عمرانی تغیر کا احساس جس میں ایک تہذیب کے ساتھ ساتھ دوسری نئی اور ترقی پذیر تہذیب ابھرتی ہے جس میں زمانے کے ساتھ چلنے ،نئے علوم اور نئی ایجادات سے فائدہ اٹھانے، انسان کی عظمت کا نیا احساس دلانے کا واضع شعور ملتا ہے۔

شبلی کے ہاں دو رجحان ملتے ہیں ایک تو ان کے ہاں حسن کی تلاش ہے۔ اس سے مراد مادی اور جسمانی حسن ہے روحانی حسن نہیں وہ حسن کے مناظر سے متاثر ہوتے ہیں اور ان پر ماہر فن کی سی نگاہ ڈالتے ہیں۔ انہیں کشمیری اور ایرانی حسن کا فرق نظر آجاتا ہے۔ ایران کے حسن کی بہت سی قسمیں انہوں نے ''سفر العجم'' میں گنائی ہیں۔وہ پردے کی

حمایت کرتے ہیں لیکن ترکی وغیرہ کے سفر میں اور عطیہ اور زہرہ فیضی سے ملاقات کے بعدملی جلی معاشرت چاہتے ہیں۔ یعنی جن میں پردہ بھی ہو اور پردہ نہ بھی ہو۔ عورتوں کی آزادی کے علاوہ عورتوں میں تحریر و تقریر، سپاہ گری، موسیقی، مصوری اور شاعری کے فن انہیں پسند ہیں۔ دوسرا رجحان ان کی اقلیت پسندی کا ہے۔ چنانچہ عقل کے ترازو میں اسلامی بادشاہوں، آئمہ دین اور عقائد کو تولتے ہیں اور جدید فلسفہ کو رائج کرنا چاہتے ہیں جو اُن دنوں اعلیٰ اور لبرل تعلیم کا مطمع نظر تھا۔

تاریخی ذوق اور علمی تحقیقات کی بناء پر مولانا ہر قسم کے میلوں (کان پور میں رام لیلا کا میلہ وغیرہ) تفریحات میں شریک ہوا کرتے تھے۔ سفر نامہ روم و مصر و شام میں قسطنطنیہ وبیروت، بیت المقدس قاہرہ وغیرہ کے حالات و واقعات بیشتر کی عام اجمالی حالت و قابل دید مقامات و مشہور عمارات سے سر رشتہ تعلیم، دارالعلوم اور مدارس، بورڈنگ اور کی تربیت تعلیم نسواں، مصنفین اور تصانیف و کتب خانے، اخبارات اور رسالے مشہور بادشاہوں اور اربابِ کمال کی ملاقات، ترکوں اور عربوں کے اخلاق و عادات کو تفصیل سے لکھا ہے۔

مولانا شبلی اور عطیہ بیگم کی خط و کتابت کے بارے میں نقادوں کا رویہ بڑا دلچسپ ہے۔ چیخوف نے نقادوں کو ان مکھیوں سے تشبیہ دی تھی جو گھوڑے کے جسم سے لپٹ جاتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال ان نقادوں کے ساتھ ہے۔ اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایک عرصے سے کسی ادیب اور شاعر کے رومان کی تلاش تھی، چنانچہ غالب کے ایک موہوم رومان کا سراغ لگایا گیا۔ میر کے متعلق بعض قیاسی بیانات دیئے گئے اور مولانا شبلی کے خطوط کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا اور ان پر رسالے لکھے گئے۔ بقول آل احمد سرور:

'' بعض حلقوں میں ان خطوط کی بنا پر شبلی کے عشق کی داستان لکھی گئی ہے۔ بعض حلقے ان خطوط کو دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے ''۔(۲۰)

شبلی بیداری نسواں کے قائل تھے۔ مگر بیداری نسواں کی یہ تحریک شبلی خود نہیں چلانا چاہتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کم ہمت تھے یا ان میں اخلاقی جرات کی کمی تھی بلکہ اس میں مصلحت یہ تھی کہ دینی تعلیم کی جو انقلابی اسکیم وہ شروع کر چکے تھے اس میں متنازع

مسائل حائل نہ ہو پائیں۔ (شاید ایسی ہی مصلحتِ تعلیم نسواں کے بارے میں سر سید احمد خان کی رہی ہوگی۔

شبلی کے الفاظ میں: ''میں وطن، احباب، آرام سب چھوڑ سکتا ہوں لیکن ایک مذہبی اور قومی کام کیوں کر چھوڑ دوں''۔(۲۱)

عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھا:

> تم کہتی ہو کہ میں بد ہمت ہوں۔ میری زندگی کے دو حصے ہیں: پرائیوٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کرسکتیں۔ تم کو کیا معلوم کہ مجھ کو کیا کیا مشکلات ہیں۔ تم کو کیا معلوم اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک برباد ہوجائے۔(۲۲)

یہاں ''پرائیوٹ'' سے مراد شبلی کے وہ خیالات ہیں جن میں بیداری نسواں کی تجویز بھی شامل ہے۔مفتون احمد لکھتے ہیں:

> تہذیب شائستگی اورعلم وفن کے لحاظ سے عطیہ بیگم اس زمانے کی مسلمان عورتوں میں ممتاز درجہ رکھتی تھیں۔ جس کی وجہ سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ صورت شکل کے اعتبار سے وہ معمولی خدوخال کی تھیں۔ شبلی ان کی ذہنی صلاحیتوں سے کام لینا چاہتے تھے۔ یہی وہ پہلو ہے جس کے شبلی ''گنہگار'' ہیں اور جسے ان کے ناقدین نے عشق و محبت، ازدواجی رشتے کی آرزو اور نرگسیت کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے''۔(۲۳)

شبلی کا درد مند دل یہ سب دیکھ کر تڑپتا رہا۔کاش مسلمانوں میں ایسی روشن خیال،تعلیم سے آراستہ، سیاسی اور ملی شعور کی حامل عورتیں ہوتیں جو قومی تحریکوں میں حصہ لیتیں، کاموں کو آگے بڑھاتیں، عرب خواتین کی طرح رضاکاروں کی کمان ہاتھ میں لے سکتیں، جو چولھا چکی کی ذمہ داریوں اور بچے پیدا کرنے کے علاوہ زندگی کی لطیف قدروں سے بھی آشنا ہوتیں!! سچ تو یہ ہے کہ حرماں نصیبی کا یہ رونااور حسرت دانشوروں کا شکوہ تھا۔وہ سب محرومیت کے احساس سے متاثر تھے مگر معاشرے کی پابندیوں سے مجبور! تاریخ کا کوئی باب یا شعر وسخن کی کوئی نازک خیالی دلوں کو گدگداتی تو جی چاہتا کہ اپنے ماحول کی جنس لطیف بھی اسی طرح لطف اندوز ہوتی۔ رضیہ سلطانی، چاند بی بی، زیب النساء،گلبدن بیگم جیسی نامور عورتوں کے کارناموں کا ذکر ہو رہا ہو تو ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ سب کسی دوسری قوم یا ملک

کی ہیروئن تھیں، اپنے یہاں ایسی صورتیں کہاں!

یہ تھا وہ ماحول جس میں شبلی سانس لے رہے تھے۔ ان کے سامنے بار بار یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ ملک کی سماجی، ثقافتی اور دوسری فلاحی تحریکوں میں مسلمان عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لاکر کیسے کھڑا کیاجائے؟ اس انداز اور اس حد تک نہ سہی جہاں دوسری قوموں کی عورتیں کھڑی تھیں، پھر بھی وہ ''چراغ خانہ'' کے بجائے ''خاتونِ مجلس'' کیوں نہیں بن سکتی تھیں۔ بے بس، مظلوم اوربے حس رہنے کے بجائے دھڑکتے دلوں کے ساتھ گردش ایام کو سمجھنے اور اس سے مقابلہ آزمائی کی صلاحیت پیدا کرکے قومی اور ملی خدمات کے لیے آگے کیوں نہیں بڑھ سکتی تھیں؟

جب شبلی بقید حیات تھے۔ وہ ان کارروائیوں سے بے خبر تو نہ رہے ہوں گے۔ مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> بمبئی میں تعلیم نسواں کے عجیب حیرت انگیز نمونے دیکھے۔ جنس لطیف کے پبلک لیکچر اور تقاریر سنیں اور پرائیوٹ صحبتوں میں ان کی قابلیت دیکھی لیکن چنداں خوشی نہیں ہوئی۔ خوشی کیسے ہوتی، جبکہ ان سرگرمیوں میں مسلمان عورتوں کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔

بمبئی میں ہندو عورتوں کی ایک کانفرنس سے متاثر ہوکر پرفیسر عبدالقادر سرفراز کو لکھا:

''زنانہ جلسہ بہت کامیابی کے ساتھ ہوا۔ گجراتی اور مرہٹی عورتیں خوب بولیں، بعض عورتیں تو مرد معلوم ہوتی تھیں۔''

عطیہ بیگم اور شبلی کے حوالے سے اس خیال آفرینی سے جو مضحکہ خیز صورت حال مترشح ہوتی ہے اس پر غور کیجئے:

الف۔ ''شبلی اور عطیہ کے سن میں تیس سال کا فرق تھا۔اس کے باوجود ۱۹۰۸ء میں وہ نکاح کی آرزو سینے میں دبائے رہے''؟

ب۔ ''شبلی کٹر حنفی مسلک کے تھے۔ عطیہ سلیمانی جوہرہ (شیعی مسلک) سے تعلق رکھتی تھی۔ کیا ایک عالم دین اور دینی تحریک کے مبلغ کے لیے ایسا رشتہ ممکن تھا''؟

ج۔ ''عطیہ بیگم اردو اور فارسی جانتی تھیں لیکن انگریزی اور فرانسیسی پر انہیں عبور حاصل تھا جبکہ شبلی انگریزی سے نابلد تھے''۔

د۔ ''عطیہ آزاد خیال اور جدید طرزِ معاشرت کی پیداوار تھی جب کہ شبلی قدیم تہذیب کے علم بردار اور پیرو۔ کیا یہ مغائرات ان کے''عشق'' کو رام کر سکتی تھیں؟''

''مکاتیبِ شبلی'' پڑھنے کے بعد کوئی ایسا تاثر پیدا نہیں ہوتا کہ وہ عطیہ کو تعلیم یافتہ، آزاد خیال، سماجی کاموں میں دلچسپی لینے والی اور اردو فارسی ادب کا شوق رکھنے والی ایک قابل عورت دیکھنے کے سوا کسی اور نظر سے دیکھتے رہے۔''(۲۴)

'حیات شبلی' میں کئی ایک جگہ لاشعوری طور پر اغلاط نظر آتی ہیں۔ انہیں لاشعوری اغلاط میں شمار کیا جاتا ہے۔ کئی ایک جگہ ماہ و سال میں اتفاق نہیں پایا جاتا اور کہیں کہیں شبلی کے انتقال کی تاریخ بھی تبدیل نظر آتی ہے۔ جیسے 'حیات شبلی' کے صفحہ نمبر ۶۶۸ پر سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔کیا عجیب بات ہے کہ اس کے چھ مہینے بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں مولانا صاحب نے وفات پائی، تو نا ممکن، ممکن نا قابل قبول، قابل قبول ہوگیا۔۔۔''(۲۵)

اس کے بعد صفحہ نمبر۷۲۴ پر لکھتے ہیں:

''۔۔۔آخر وفات سے تین دن پہلے ۱۵ نومبر کو مولانا حمیدالدین صاحب کو حیدر آباد، مولانا ابوالکلام کو کلکتہ اور مجھے پونہ ،کلکتہ اور و سینہ کے پتے سے تاردیئے ۔۔۔' '(۲۶)

پھر صفحہ ۷۲۵ حیات شبلی پر لکھتے ہیں:

''۔۔۔آخر ۱۸ نومبر ۱۹۲۴ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کی صبح ساڑھے پانچ بجے بروز چہار شنبہ روح نے آخری سانس لی۔۔۔''(۲۷)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا انتقال تو ۱۸نومبر ۱۹۱۴ء کو فرما گئے تھے تو یہ خط اور دیگر تاریخ وفات میں تضاد سے سید صاحب کیا ظاہر کرنا چاہتے تھے۔یا یہ لاشعوری طور پر غلطی ہوئی ہے یا یہ مورخانہ حقائق سے پردہ پوشی کا سبب ہے۔

'حیات شبلی' میں مرتبِ حیات نے مکاتیب شبلی سے اتنا استفادہ کیا ہے کہ اس کو خود نوشت قرار دیا ہے۔'' اس نظریے سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ 'حیات شبلی' درحقیقت مولانا کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔''ہم جب تنقیدی نظر سے کتاب کو پڑھتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سید صاحب نے اصول سوانح نگاری سے دانستہ اعراض کیا ہے۔ بیشتر رطب یا

بس روایات پر واقعات کے ہوائی قلعے بنائے اور دوسروں پر گولہ باری کی ہے۔ واقعات کی تخلیق اور ان کا اخفاء حق وباطل کی تلبیس و مبالغہ علی گڑھ تحریک اور سر سید کی تنقیص و واقعات کا ایک طومار ہے۔

مولانا شبلی کی سوانح حیات اور کارناموں کے مطالعے کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی تالیف 'حیات شبلی' بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ سید صاحب کا فن ٹھوس اور محققانہ ہے اگرچہ ان کے یہاں مولانا شبلی کے ساتھ ایک سوانح نگار کی نہیں بلکہ ایک شاگرد کی عقیدت اور ہمدردی ملتی ہے اور بعض نا قدین نے ان کے چند بیانات کی تردید بھی کی ہے پھر بھی یہ کتاب ایک بڑا اہم کارنامہ ہے۔یہ ایک عہد کی تاریخ ہے۔ ایک چلتی پھرتی زندگی کا واضح اور روشن احساس ہے۔ جس نے ماحول سے فائدہ اٹھایا اور ماحول کا مقابلہ کیا۔

سید سلیمان ندوی کا معیار تنقید خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے، یعنی وہ اپنے معتقدات اور جذبات کی روشنی میں تبصرہ کرتے ہیں۔ جس طرح باسول (Baswell) اپنی کتاب ''حیات ڈاکٹر جانسن'' میں اپنا کردار بھی کہیں کہیں پیش کرتا ہے۔ اسی طرح حیات شبلی میں سید صاحب کی اپنی زندگی اور اپنے نظریات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ سید صاحب کا طرزِ بیان دلنشیں اور متن، سلیس اور پختہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں شبلی جیسی رنگینی، شوکت اور رومانیت نہیں ہے بلکہ حالی جیسی سادگی، خلوص اور بے تکلفی ہے۔

'حیات شبلی' استاد مرحوم کا مرثیہ بھی ہے اور خراج عقیدت بھی۔ مگر دراصل یہ شبلی کی علمی ،ادبی، تدریسی اور سیاسی معرکہ آرائیوں کا مائکروفلم ریکارڈ ہے۔

معرکۃ الآراء کتاب محض 'تذکرہ شبلی' تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے کینوس پر انیسویں اور بیسویں صدی کے غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی، مذہبی، تعلیمی، سیاسی تگ ودو کی پوری داستان سمٹ آئی ہے۔ مگر افراد و اشخاص اور مختلف درس گاہوں اور انجمنوں کے ہجوم میں بھی نقطہ ماسکہ شبلی ہی کی ذات ہے جس کے گرد یہ ساری کہانی گھومتی ہے۔سید صاحب نے ''حیات شبلی'' لکھتے وقت ایک لمحہ کے لیے بھی صاحب سوانح کی بنیادی حیثیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور کتاب کے ہر صفحہ کو ادب و انشاء کی چاندنی سے معمور کردیا ہے۔

خلاصۂ کلام

'حیاتِ شبلی' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب نے سوانح کے اصولوں کو پوری طرح مد نظر نہیں رکھااور ان حقائق سے پردہ پوشی کی جن سے شبلی کی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ مصنف 'حیات شبلی' خود ایک محقق ومورخ ہیں۔ انہوں نے 'حیات شبلی' میں اعظم گڑھ اور اس کے اطراف اور ندوۃ العلماء کے حالات وواقعات کی جو تصویر کشی کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ اس سے اس عہد کے تعلیمی، تہذیبی و قومی پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سید صاحب نے اس عہد کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی اس حیات میں تحریر کیا جو اس سوانح کی شخصیت سے متعلق تھا مگر انہوں نے ایک استاد کے شاگرد خاص ہونے کی نسبت سے شخصیت سوانح کے اُن پہلوؤں کو اجاگر نہیں کیا جن سے شبلی کی شخصیت اور ذات دونوں مجروح ہوتی ہے۔ اگرچہ ان اصولوں سے اغماض کا سبب وہ استاد سے عقیدت بتاتے ہیں مگر سوانح کی اصل روح جو کہ شخصیت کے محاسن و معائب ہوتے ہیں، ان سے گریز کیا۔ سوانح نویسی کے فرائض میں سے جو بڑا فرض مصنف سے رہ گیا ہے، وہ تنقید ہے۔ مصنف نے ممدوح کی خوبیاں دکھائی ہیں، اس کے کسی قول وفعل پر نکتہ چینی نہیں کی۔ سید صاحب نے مولانا شبلی کے محاسن نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھائے ہیں اور کہیں کہیں نہایت کمزور اورضعیف الفاظ میں ایک آدھ جگہ اعتراض بھی کیا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ وہ شبلی کے محاسن کی طرح نظر آتے ہیں۔ سید صاحب نے سوانح میں ان اصولوں کو بھی برتنے سے اجتناب کیا جو انہوں نے خود مولوی حبیب الرحمان شیروانی کی سوانح لکھتے وقت وضع کئے تھے۔ خط میں لکھتے ہیں:

''صحابہؓ کے حالات سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے لیے نمونہ نہیں بن سکتی۔ ہر پہلو کو لیجئے اور ان پہلوؤں کو صاف صاف دکھایئے جن سے آج کل کے مولوی قصداً چشم پوشی کرتے ہیں۔''(۲۸)

الغرض ہر انسان کی زندگی میں، انبیاء کو مستثنیٰ کر کے، اچھائیوں کے ساتھ کچھ برائیاں بھی ہوتی ہیں۔ روشن پہلو کے بالمقابل تاریک پہلو بھی ہوتا ہے اور سوانح نگاری کی نظر ان

دونوں پہلوؤں پر ہونی چاہیے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی سوانح میں ایک پہلو کو چھوڑ دیا جائے تو وہ سوانح عمری مکمل کہلانے کی مستحق ہوتی ہے یا نہیں؟

بہر حال ہم نے اس مقالے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے نہ تو شبلیؒ کی بے جا مدافعت منظور ہے اور نہ ان کی معصومیت جتانا مقصود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی نے بھی اس سوانح کو اس رخ سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی کی سچی تصویر تین مختصر مگر نہایت بلیغ اور خوب صورت جملوں میں پیش کردی ہے۔ پہلے انہوں نے لکھا: ''شبلی نرے خشک مولوی نہ تھے'' پھر انہوں نے لکھا کہ:''شبلی شبلی تھے، جنیدؒ، شبلی نہ تھے۔'' اور اس اظہار میں بھی کوئی پروا نہیں کی کہ مولانا(شبلی) میں وہ پابندی اور مذہبی تورع و تقدس جو علمائے دین کا خاصا ہے، نہیں تھا۔''

لیکن اس سے یہ مطلب نکالنا بھی غلط ہے کہ قیاس و معروضیات کی بنیاد پر اور واقعات کو مسخ کرکے ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کردی جائیں جن میں حقیقت نہ ہو۔

'' سچ تو یہ ہے کہ شبلیؒ ''معصوم'' رہے ہوں یا نہ رہے ہوں''مظلوم'' ضرور بن گئے''۔

حوالہ جات

۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)

۲۔ ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی، علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت و ادبی خدمات،(لکھنو،مکتبہ فردوس مکارم نگر،۱۹۸۵ء)،ص۶۔

۳۔ ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی، علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت و ادبی خدمات،(لکھنو،مکتبہ فردوس مکارم نگر،۱۹۸۵ء)،ص۸۔

۴۔ مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۱۔

۵۔ مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۵۔

۶۔ مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۸۔

۷۔ شیخ محمد اکرام،شبلی نامہ ،(بمبئ،تاج آفس محمد علی روڈ ،سن ندارد)،ص۵۔

۸۔ شیخ محمد اکرام،شبلی نامہ ،(بمبئ،تاج آفس محمد علی روڈ ،سن ندارد)،ص۵۔

۹۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا،حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۱۰۴۔
۱۰۔ شیخ محمد اکرام،شبلی نامہ ،(بمبئ،تاج آفس محمد علی روڈ ،سن ندارد)،ص۴۱۔
۱۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۲۸۸۔
۱۲۔ مولانا سید سلیمان ندوی،حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۲۸۸۔
۱۳۔ مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۳۸۔
۱۴۔ مفتون احمد،مولانا شبلی نعمانی ایک مطالعہ،(کراچی،مکتبہ اسلوب،۱۹۸۶ء)،ص۲۶۔
۱۵۔ شیخ محمد اکرام،شبلی نامہ ،(بمبئ،تاج آفس محمد علی روڈ ،سن ندارد)،ص۹۴۔
۱۶۔ شیخ محمد اکرام،شبلی نامہ ،(بمبئ،تاج آفس محمد علی روڈ ،سن ندارد)،ص۱۹۹۔
۱۷۔ شیروانی خان،حبیب الرحمٰن،مقالات شیروانی،(علی گڑھ،علی گڑھ پرنٹنگ پریس،۱۹۴۷ء)،ص۱۷۱
۱۸۔ شیخ محمد اکرام، یادگار شبلی،(لاہور،مطبوعہ دین محمد پریس،۱۹۷۱ء)،ص۸۲۔
۱۹۔ مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۵۱۳۔
۲۰۔ مفتون احمد،مولانا شبلی نعمانی ایک مطالعہ،(کراچی،مکتبہ اسلوب،۱۹۸۶ء)،ص۱۲۲۔
۲۱۔ فقیر محمد امین زبیری، سید محمد یوسف(مرتبہ)خطوط شبلی ،(آگرہ،شمسی مشین پریس،سن ندارد)،ص۳۹۔
۲۲۔ فقیر محمد امین زبیری،سید محمد یوسف (مرتبہ)خطوط شبلی ،(آگرہ،شمسی مشین پریس،سن ندارد)،ص۳۹۔
۲۳۔ مفتون احمد،مولانا شبلی نعمانی ایک مطالعہ،(کراچی،مکتبہ اسلوب،۱۹۸۶ء)،ص۷۱۔
۲۴۔ سید شہاب الدین دسنوی،شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں،(دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۷ء)، ص، ۷۲۔
۲۵۔ مولانا سید سلیمان ندوی،حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۶۶۸۔
۲۶۔ مولانا سید سلیمان ندوی،حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۷۲۴۔
۲۷۔ مولانا سید سلیمان ندوی،حیات شبلی،(اعظم گڑھ،مطبع معارف دار المصنفین،۱۹۷۹ء)،ص۷۲۵۔
۲۸۔ امین الدین زبیری،شبلی کی رنگین زندگی،(لاہور،عمر پبلشرز،۱۹۵۲ء)،ص۲۵۔

NIHCR

عجائب الاسفار

سفرنامہ ابن بطوطہ

ترجمہ مع حواشی و تعلیقات

از

خان بہادر مولوی محمد حسین صاحب

قومی ادارہ برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت

مرکزِ فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، (نیو کیمپس)، اسلام آباد

۲۰۱۹ء